© rasailojaraid.com

اسلام اور ریاست...

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
شیخ الحدیث: جامعہ دارالعلوم کراچی

غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان کی جو تحریک چلی، اس کی بنیاد مسلم قومیت کے نظریے پر تھی، انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں جو تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے، قائداعظم نے پورے زور وشور اور دلائل کی روشنی میں یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم، مسلمان رہنماؤں، اہل فکر اور علمائے کرام نے اس کی بھرپور تائید کی اور میرے بچپن میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کی جو صدائیں گونجتی تھیں، ان کی دلکش یاد آج بھی کانوں میں محفوظ ہے۔ آخر کار مسلم اکثریت نے قائداعظم کی اس پکار پر لبیک کہا، اور ناقابل فراموش قربانیوں کے بعد ہمالیہ کے دامن میں ارض پاک ایک حقیقت بن کر ابھری، نظریہ پاکستان کی بنیاد تو واضح تھی لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے دستور پاکستان کیلئے وہ قرارداد مقاصد بااتفاق منظور کی جس نے ملک کا رخ واضح طور پر متعین کردیا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے، اور عوام کے منتخب نمائندے اپنے اختیارات قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر استعمال کرسکیں گے، اور یہ قرارداد 1954، 1956، 1962 اور 1973 کے تمام دستوری مسودوں کا الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جزبنی رہی، اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کرسکتے ہیں چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا، اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہوگیا پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسودات دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جاسکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا سن 1973ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے، اس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا، اور اس پر بفضلہ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں جس کا مظاہرہ اور اس کی مزید تاکید حال ہی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہوگئی ہے، اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دستور کی بنیادی روح کالازمی حصہ قرار دیا ہے۔

اب کچھ عرصے سے کچھ آوازیں پھر گونجنے لگی ہیں کہ ملک کو اس دہشت گردی سے پاک کرنے کیلئے اسے سیکولر بنانا چاہئے یعنی نصف صدی سے زائد جو فکری، سیاسی اور عملی جدوجہد ملک کا صحیح رخ متعین کرنے کیلئے ہوئی ہے اس کی بساط لپیٹ کر پھر الف با سے آغاز کرنا چاہئے ایک ایسے موقع پر جب ملک کے تمام طبقات دہشت گردی کے عفریت کو مل کر شکست دینے کیلئے کمر بستہ ہیں ملک کی بنیاد اس کے قیام کے نظریے اور اس کے متفقہ رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش اس فضا میں جو پنڈورا بکس کھول سکتی ہے اور اس سے جو انتشار جنم لے سکتا ہے اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اسی فضا میں سیکولرازم کے حامی حضرات جو کچھ فرمارہے ہیں اس کی بازگشت مذہب کے نام پر ایک مذہبی بیانیہ کے عنوان سے سامنے آئی ہے جو روزنامہ جنگ کے 22 جنوری کے شمارے میں ''اسلام اور ریاست' ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے بجائے اپنے افکار کو 'مذہبی بیانیہ'' قرار دیا ہے اس ''بیانیہ'' کا مقصد انہوں نے شروع ہی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورتحال کی اصلاح کر سکتا ہے'' اس جوابی بیانیے (Counter narrative) کے جو نکات انہوں نے بیان فرمائے ہیں' ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سے تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا اس مضمون میں یوں تو بہت سی باتیں قابل تبصرہ ہیں لیکن ان تمام نکات پر تبصرہ بہت طول چاہتا ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں لیکن ان میں سے چند متضاد نکات اور ان کے مضمرات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ نکات نہ صرف پاکستان کے قیام کے نظریے ہی کی نفی کرتے ہیں' بلکہ ملک کو ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے عملی اطلاق کی کوئی معقول صورت کم از کم مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آسکی۔

سب سے پہلے نکتے میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے' اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جائے گا'' اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں جو قرارداد مقاصد درج ہے' یا اس میں جو پابندی عائد کی گئی ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا' یہ قطعی طور پر نہ صرف غیر ضروری' بلکہ بے بنیاد خیال پر مبنی ہے قرارداد مقاصد کا بنیادی تصور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار ہے' اور اسے غیر ضروری اور بے بنیاد قرار دینے کا نتیجہ ریاست کیلئے اس حاکمیت اعلیٰ کے اقرار کو بے بنیاد قرار دینے کے سوا اور کیا ہے؟

یہ بیانیہ وہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے مقابلے میں یا اس کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں' لیکن اول تو یہ بات سمجھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے بالاتر ہے کہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' اور ''مذہبی بیانیہ'' کے اس نکتے میں کیا فرق ہوا؟ سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ ''ریاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ دین ایک خالص انفرادی معاملہ ہے'' وہ بھی یہی کہتا ہے کہ پارلیمان پر کسی دین کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی' لہٰذا قرارداد مقاصد کی کوئی ضرورت نہیں اور یہی باتیں مضمون اس نکتے میں بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں کیا عنوان بدل دینے سے حقیقت میں کوئی فرق آجاتا ہے؟

پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد آگے خود وہ نکتہ نمبر 8 میں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد امرھم شوریٰ بینھم کا تقاضا ہے کہ ملک میں ایک پارلیمان قائم ہونی چاہئے' اور ''علاوٗں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہوسکتا۔ امرھم شوریٰ بینھم کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی''۔

ان دونوں باتوں کے مجموعے سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ پارلیمان وجود میں تو قرآنی حکم امرھم شوریٰ بینھم کے تحت آئیگی مگر اس کے بعد اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے' البتہ ملک کے افراد اور ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پارلیمان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے' اور نہ پارلیمان کے فیصلوں کو قرآن وسنت کا پابند کیا جاسکتا ہے' تو ''امرھم شوریٰ بینھم'' کا قرآنی اصول اس کیلئے کس بنیاد پر لازم ہوگیا؟ اور یہ بات کس بنیاد پر کہی جارہی ہے کہ ''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے'' جبکہ ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمان مغربی ممالک کی طرح ہم جنس شادیوں کا قانون نافذ کر دے' تو کیا قرآن کریم کا باہمی مشاورت کا یہ اصول پھر بھی ''ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ پارلیمان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ قرآن وسنت کیخلاف قانون سازی نہ کرے؟

پھر انہوں نے آگے اپنے نکتہ نمبر 9 میں فرمایا کہ ''دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کر سکتا ہے'' ''نظم اجتماعی'' سے ان کی مراد غالباً حکومت ہی ہے' تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو بزور قانون لازمی قرار دے کر بے نمازیوں پر سزا جاری کرے؟ اگر یہ واقعی کوئی قرآن کریم کا حکم ہے کہ نماز کا مطالبہ قانون کی طاقت سے کیا جائے' جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے' تو پھر ''اگر چاہے'' کی جو شرط انہوں نے لگائی ہے' اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس قرآنی حکم پر عمل حکومت کی چاہت پر موقوف ہے' لہٰذا اگر وہ نہ چاہے تو اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس صورت میں سورۃ احزاب کی اس آیت (نمبر 36) کا کیا مطلب ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے ''اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کیلئے یہ گنجائش نہیں ہے کہ انہیں اپنے معاملے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کوئی اختیار باقی رہے''۔

آگے معاشرتی احکام کے حوالے سے اپنے نکتہ نمبر 1 میں وہ فرماتے ہیں ''حکومت ان کی (عوام کی) رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس ان پر عائد نہیں کر سکے گی، ان کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اس نوعیت کے دوسرے امور اگر ان میں کوئی نزاع ہو تو اس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔'' یہاں پھر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور اس پر قرآن وسنت یا شریعت کے مطابق قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں، تو عدلیہ پر ان احکام میں شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابندی کس بنیاد پر ہوگی؟ اور اگر ان معاملات میں پالیمان شریعت کے بجائے کسی اور قانون کی پابندی کا حکم دے تو اس کے سامنے نکتہ نمبر 8 کے تحت سر تسلیم کیوں خم نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''ان کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس عائد نہیں کرے گی'' ظاہر ہے کہ اس میں عوام کی رضامندی سے مراد پارلیمان کی مرضی ہے، لہٰذا مذکورہ جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کے لئے تو پارلیمان کی منظوری درکار ہے، لیکن زکوٰۃ حکومتی سطح پر عائد کرنے کے لئے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہی مقصود ہے، تو حکومت پارلیمان کے کسی قانون کے بغیر زکوٰۃ کس بنیاد پر وصول کرے گی اور اس کی اس اتھارٹی کا سرچشمہ کیا ہوگا۔ اگر وہ سرچشمہ قرآن کریم ہے تو کہنا ہوگا کہ قرآن کریم پارلیمان پر بالادستی رکھتا ہے۔ پھر ریاست کا کوئی مذہب نہ ہونے کا اصول کہاں گیا؟ آگے انہوں نے فرمایا ہے ''ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی، خاندانی، اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں، تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائے گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کیلئے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔

یہاں دو سوال پھر پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسی صورت میں پارلیمان اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں پر یہ قرآنی سزائیں جاری کرے؟ اگر قرآن کریم کے حکم کے تحت لازم ہے تو جب پارلیمان پر قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں ہے، تو اس پر یہ پابندی کیسے لازم ہوگی کہ وہ قرآنی سزائیں ہی جاری کرے اور ان معاملات میں اپنی طرف سے کوئی اور سزا تجویز نہ کرے، یا ان میں سے کسی جرم (مثلاً زنا بالرضا) کو جائز قرار نہ دے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ سزائیں قرآن کریم ہی کی بنیاد پر دی جائے گی تو کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی تفریق ہے کہ یہ سزائیں صرف ان مسلمانوں کے لئے ہیں جو شعور کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کریں، اور غیر مسلم چوروں، قاتلوں اور فساد فی الارض پھیلانے والوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا جائے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہوں گی؟ انہوں نے اپنے اس ''بیانیے'' میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کہ عام طور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر سمجھا جاتا ہے قرآن وحدیث میں کسی جگہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں، یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہئے۔'' یہ وہی دو قومی نظریہ کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر قائداعظم نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ یہاں مودبانہ گزارش یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر لغت یا عرف عام کے مطابق لفظ ''قوم'' کا اطلاق درست ہے یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ مستقل سیاسی اور اجتماعی وحدت کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کو (چاہے وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں) غیر مسلموں سے الگ سمجھنا اور اس بنیاد پر ان کے لئے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اور جس کی بنیاد پر آج ہم ایک الگ ملک کی حیثیت سے بیٹھے ہیں، اس کا مطلب یہی تھا، اس دو قومی نظریہ پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لئے ''قوم'' کا لفظ استعمال کرنا لغت اور عرف عام کے اعتبار سے درست نہیں ہے، لیکن ان کا مقصد ''مستقل سیاسی وحدت'' تھا جس کی بنیاد پر اپنے اختیار سے کوئی حکومت قائم کی جائے۔ لغوی اعتبار سے تو تمام انبیاء علیہم السلام کی مخاطب ان کی قومیں ہی تھیں، لیکن انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی مستقل سیاسی وحدت قائم نہیں کی، اور اگر کوئی ریاست قائم ہوئی تو وہ وطن اور رنگ ونسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر ہوئی، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد وسلیمان علیہم السلام کی حکومتیں اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی حکومت، البتہ اس میں غیر مسلموں کو تمام شہری اور مذہبی حقوق برابر حاصل تھے۔

انہوں نے ایک اور بات اپنے نکتہ نمبر 2 میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ ''نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے، اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔'' قرآن کریم نے سورۂ بقرہ آیت نمبر 30 میں حضرت آدم علیہ اسلام کے تذکرے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور سورۂ ص آیت نمبر 26 میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ہم نے تمہیں زمین خلیفہ بنایا ہے۔'' نیز سورۂ نور آیت نمبر 55 میں ارشاد فرمایا ہے: ''تمہیں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں خلافت عطا فرمائے گا، جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی تھی، اور ان کے لئے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا۔ جسے ان کے لئے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے، اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا فرمائے گا، وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔'' اس کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں اسلامی ریاست کے امیر کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ اور اس کی حکومت کو خلافت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کے ان ارشادات کی بنا پر اسلامی لٹریچر اس اصطلاح سے بھرا ہوا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے عبقری عالم ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ ''خلافت'' کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخر کار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔'' (مقدمہ ابن خلدون: باب 3 فصل 25 ص 189)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن وحدیث کے ان ارشادات اور چودہ سو سال سے اس اصطلاح کے معروف ومشہور بلکہ متواتر ہونے کے باوجود یہ فرمانا کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، اس پر تبصرے کیلئے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ "مذہبی بیانیہ" دہشت گردی کے موجودہ مسائل کی اصلاح کرسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دستور پاکستان کو تلپٹ کرکے ان متضاد نکات کی بنیاد پر نئے سرے سے دستور بنایا جائے تو دہشت گرد اپنی دہشت گردی سے باز آجائیں گے یا ان کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے موجودہ دستور میں چند جزوی باتوں کے سوا کوئی خرابی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے جوہری احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا ہے ہمارے دستور میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کو پوری طرح حاصل نہیں ہیں، پالیسی کے جو اصول بنائے گئے ہیں ان پر ایک دن عمل نہیں ہوا صوبوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں، وہ نہیں مل رہے ہے عوام کو قدم قدم پر مشکلات، رشوت ستانی اور ظلم وستم کے سامنا ہے، معیشت کے میدان میں اونچ نیچ حد سے بڑھی ہوئی ہے سرکاری دفتروں سے کام کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، عدل و انصاف کے دروازے غریبوں کے لئے تقریباً بند ہیں دستور میں یہ لکھا ضرور ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور اس کے لئے دستور نے ایک میکنزم بھی تجویز کردیا ہے جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو وہ فرقہ واریت کا بھی سدباب کرسکتا ہے لیکن اسے برسرکار لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی یہ مجموعی صورتحال عوام میں مایوسی اور چڑچڑاہٹ پیدا کرتی ہے اور شرپسند لوگوں کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ یہ اصلاحات پرامن ذرائع سے نہیں ہوسکتیں اور حکومتوں کے اس طرز عمل نے اس بات کو مزید ہوا دی ہے کہ جو مطالبہ شریفانہ طور سے وعظ ونصیحت اور مشورے کے طور پر کیا جائے حکومت اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتی اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی مطالبہ اسی وقت قابل سماعت ہوسکتا جب وہ ہڑتال اور جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ کیا جائے اور اسی کا آخر حل یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھالئے جائیں ملک کے دشمن مسلسل اس فکر کو ہوا دے رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے لہٰذا مسئلہ دستور میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں، مسئلہ اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کا ہے، اگر اس پر سنجیدگی سے عمل ہونے لگے، عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انصاف میسر ہو اور اسلام کے عادلانہ قوانین ان کی روح کے ساتھ نافذ کئے جائیں، مجرموں کو انصاف کے تمام تقاضوں کے ساتھ عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو یہ مسلح تحریکیں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔ خدا کیلئے نیا انتشار پھیلانے کے بجائے متحد ہو کر اس جہت میں کام کریں۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com